مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

امت مسلمہ کے اندازِ فکر میں انقلاب کی ضرورت

اس وقت ہم مسلمانان عالم "امت مسلمہ" کے بارے میں جو نظریہ رکھتے ہیں اور اس کو جس نظر سے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں وہ فکر و نظر کا ایک افسوسناک انقلاب ہے۔ ایک طویل عرصہ سے ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ امت مسلمہ اس سے زیادہ کچھ حیثیت و حقیقت نہیں رکھتی کہ وہ دنیا کے بہت سے انسانی جتھوں میں سے ایک جتھا ہے جو اس ربع مسکون کے مختلف حصوں میں تقسیم ہے، مختلف کمروں اور مختلف گوشوں میں پھیلا ہوا ہے، اس میں مختلف قوموں، نسلوں اور ملکوں کے لوگ شامل ہیں۔ مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف مقامی معاشرت و معیشت رکھنے والے اس کے حلقۂ منتسبین میں ہیں۔ جگہ جگہ اسکے گرد و پیش مخصوص مقامی حالات و مخصوص ماحول ہے، اس کی طاقتیں اور صلاحیتیں اور اسکے مادی وسائل و ذرائع ہر جگہ محدود ہیں......... اسکی ان مختلف در مختلف شاخوں اور حصوں میں قدر مشترک دو ....اور صرف دو .... مسلم بنیادیں اور حقیقتیں ہیں، ایک "عقیدہ کی وحدت" دوسری "مغرب کی دریوزہ گری اور مرعوبیت، اور سیاست و معیشت میں اس پر کلی انحصار و اعتماد۔"

دنیا کے نقشہ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو اپنی ذات اور اپنی قیمت و حیثیت کا اندازہ ہم انھیں طاقتوں اور انھیں مادی وسائل و امکانات .... مواد خام ملکی آمدنی و تحصیل، تعداد نفوس اور فوجی طاقت و قوت .... کی بنیادوں پر کرتے ہیں، اسی میزان و معیار پر ہم اپنے کو تولتے ناپتے ہیں، اور فیصلہ کرتے ہیں کہ فلاں ملک و مقام پر ہم کچھ قوی ہیں، ہمارا پلڑا بھاری ہے اور فلاں ملک و مقام میں ہلکا۔ بعض وقت ہم کو اپنا وجود بالکل بے وزن نظر آنے لگتا ہے، اور بعض حالات میں ہم اپنے کو موثر اور وزنی محسوس کرنے لگتے ہیں، بحیثیت مجموعی ہم اپنی کوئی خاص طاقت و قیمت نہیں پاتے۔

ہم نے آج مغرب کی امامت و پیشوائی کو ایک ناگزیر اور لابدی شئے سمجھ لیا ہے، اس پر اس طرح ایمان لے آئے ہیں جیسے اس میں کسی تغیر و تبدیلی کا امکان ہی نہیں، تاریخ اسلام میں ایک وقت آیا تھا جب مسلمانوں کی زبانوں پر یہ فقرہ چڑھا ہوا تھا "إذا قيل لك ان التتر انهزموا فلا تصدق" (اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی تو یقین مت کرنا (۱) مسلمانوں کی بدقسمتی سے یہی جملہ ایک

(۱) ساتویں صدی ہجری میں جبکہ تاتاری عالم اسلام پر چڑھ آئے تھے، اور اس سرے سے اس سرے تک ان سے مرعوبیت اور دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ یہ جملہ اسلامی معاشرے میں زبان زد خاص و عام تھا، اور تاریخ میں بالاتفاق منقول و ماثور ہے۔

دوسرے عنوان سے پھر مسلمانوں میں رائج ہو گیا ہے، اور انکا عقیدہ وایمان بنتا جارہا ہے کہ مغرب نا قابل شکست ہے اور موجودہ حالات میں تبدیلی خارج از بحث ہے۔

ہمارا حال یہ ہے کہ ہم مغرب سے آنکھیں ملانے کا تصور تک نہیں کرسکتے، اور اگر کبھی ہم اپنی "دانش مندی و دور اندیشی" اور علم و مطالعہ و تجربہ سے نظریں بچا کر اس کی مخالفت کا تصور دل میں لاتے بھی ہیں تو ہم اپنے امکانات و وسائل، اپنی مادّی قوت و طاقت، عسکری صلاحیت اور جنگی انتظامات کا جائزہ لینے لگتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ جدید ایجادات اور ایٹمی آلات حرب میں ہمارا کیا حصہ ہے؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم پر یاس و حرماں نصیبی اور اپنی شومیٔ قسمت کا احساس طاری ہو جاتا ہے، ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم دنیا میں ضعف و پستی اور ذلت و خواری ہی کیلئے پیدا کئے گئے ہیں، ہماری اپنی کوئی زندگی نہیں، ہم مغربی قوموں کے حاشیہ بردار اور دست نگر بن کر زندگی گزار سکتے ہیں، زندگی کی اس دوڑ میں خود ہمارا کوئی حصہ نہیں، ہم دنیا کے اس اسٹیج پر کوئی اہم پارٹ ادا نہیں کرسکتے، ہماری قسمت میں ہی مقدر ہے کہ ہم مغرب کے دو "حریف خاندانوں" میں سے کسی ایک کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کردیں اور اس کے رحم و کرم پر زندگی گزاریں۔ یہی انداز فکر ہے جو آج تمام عالم اسلام پر چھایا ہوا ہے، تمام مسلم اقوام و مسلم ممالک اسکے شکار ہیں، کیا عرب، کیا عجم ہر جگہ یہی ذہن کام کر رہا ہے، ممالک عربیہ سے لیکر پاکستان، انڈونیشا و ترکی تک کے مسلمان اسی طرز پر سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہندوستان، چین، شام و برما (جہاں مسلمان اگرچہ اقلیت میں ہیں لیکن کثیر تعداد میں ہیں) اس سے آگے ایک حرف نہیں سوچتے، اسی انداز فکر کو اس وقت تمام اسلامی دنیا میں صحیح، دانشمندانہ اور علمی انداز فکر سمجھا جاتا ہے، اور یہی بلند سے بلند پرواز فکر ہے

لیکن تاریخ عالم بتلاتی ہے کہ اسی عالم اسباب و عالم مادی میں ایک جماعت انسانی ایسی بھی پائی گئی ہے جو اس انداز فکر اور اس منطق و استدلال کو قبول کرنے سے انکار کرتی رہی ہے، اس جماعت کا اپنا ایک مخصوص طریق فکر و طریق عملی ہے، تاریخ شاہد ہے کہ اس جماعت کے افراد نے اپنے مقاصد میں اعلیٰ درجہ کی کامیابی حاصل کی ہے، دنیا کے تمام انقلابات میں اصلح و افضل، اعلیٰ و مفید تر انقلابات کا وجود انہیں کے دم سے ہوا، ان کے اس انداز فکر پر تاریخ کے ان قوی ترین و عظیم ترین انقلابات کی بنیاد ہے جنہوں نے دنیا کے مسلمات و مزعومات اور رسوم و قیود کو اس طرح بدل ڈالا ہے کہ عالم انگشت بدنداں رہ گیا ہے، یہ وہ انقلابات ہیں جس نے ایک طویل مدت کی سیاہ بختی کے بعد دنیا کو آفتاب سعادت کا نور بخشا ہے، اور ایک وسیع ابتری، ایک عالمگیر فساد کے بعد معاشرۂ انسانی کو طمانیت و راحت کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔

تنہا یہی وہ طریق فکر ہے جس میں ان پسماندہ و شکست خوردہ، کمزور و بے سروسامان قوموں کے

لئے نوید جاں فزا ہے، جن کے پاس دنیا کے لئے کوئی صالح و صحیح دعوت و پیغام ہو۔

کوئی امت جس کا سرمایۂ امید اور منتہائے علم و نظر محض علم اسباب و خواص اشیاء ہی ہو، جو مادیات و محسوسات اور سازو سامان اور اس کی کثرت و فراوانی ہی پر سارا دارومدار وانحصار سمجھتی ہو، جس کا یقین ان اشیاء عالم و مادیات عالم سے آگے کسی چیز پر نہ ہو اور پھر جس چیز پر اس کا یہ یقین و ایمان ہے اس میں وہ دیوالیہ بھی ہو........ تو اس کے لئے سوائے مایوسی وافسردگی اور نوحہ و ماتم کے اور کیا ہے؟ اُس کی ناامیدی و یاس کا کیا ٹھکانا جس کے درد کی دوا موت کے سوا کچھ نہ ہو ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے

آپ سوال کریں گے کہ ایسی بھی کوئی جماعت ہو سکتی ہے جو اپنے گردو پیش سے آنکھیں بند کر کے سوچ سکتی ہو اور اگر ہو بھی سکتی ہے تو پھر وہ کامیاب و بامراد بھی ہو سکتی ہے؟ آپ اس کیلئے تاریخ کی کوئی مثال اور کوئی عملی نمونہ چاہیں گے، ذرا ماضی کے اوراق الٹئے اور "صحف صادقہ" اور "وحی آسمانی" کی طرف کان لگایئے۔

سرزمین مصر پر ایک ظالم و جابر "بادشاہ" فرمانروا ہے جس نے قوم بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے، ان کے ساتھ جانوروں اور چوپایوں کا سا معاملہ کرتا ہے، ان کے اندر نہ کوئی حوصلہ اور امنگ ہے نہ کوئی ولولہ اور جوش، ان کا "حال" پریشان، مستقبل تاریک، تعداد کے اعتبار سے ایک حقیر اقلیت، سامان کے لحاظ سے فقیر و بے بضاعت، اہمیت کے اعتبار سے حقیر و بے حیثیت، دشمن قاہر و زبردست، ظالم و بے درد، خود بیکس و بے بس، بے یار و مددگار، نہ دوست نہ غمخوار، نہ حامی نہ مددگار، ایک حتمی و یقینی انجام۔ ہلاکت آنکھوں کے سامنے، اور انجام سے پہلے جب تک زندہ ہیں بدبختی و بدنصیبی، مصیبت و کلفت زندگی کیساتھ، نمک بر جراحت یہ کہ ظالم نسل کشی پر آمادہ، اور قومی زندگی کے بقاو تسلسل کا دشمن ہے۔

اس خونی، بھیانک اور ہلاکت خیز ماحول میں موسیٰؑ پیدا ہوتے ہیں، فرعون جو بادشاہ وقت ہے، چاہتا ہے کہ موسیٰؑ پیدا نہ ہوں مگر وہ پیدا ہوتے ہیں، وہ چاہتا ہے کہ زندہ نہ رہیں مگر وہ زندہ رہتے ہیں، لکڑی کے ایک سربمہر صندوق میں رہنا پڑتا ہے مگر وہ وہاں بھی زندہ رہتے ہیں، نیل کی بے شعور و بے درد موجوں کے حوالے کردئے جاتے ہیں مگر پھر بھی زندہ رہتے ہیں، حتیٰ کہ اللہ کی قدرت اپنا تماشہ دکھاتی ہے کہ وہ اپنے سب سے بڑے دشمن، خونی و وحشی جلاد کی گود اور اس کی حفاظت و نگرانی میں پلتے بڑھتے ہیں، دوربین، بیدار مغز پولیس کی عقابی نگاہوں سے وہ مستور و مخفی رہتے ہیں، پھر ان کو مصر سے جلاوطن ہونا پڑتا ہے، مسافرت و کسمپرسی کی حالت میں ایک درخت کے سایہ میں پناہ لیتے ہیں، لیکن اللہ ان کے

لئے ایک باعزت و کریمانہ ضیافت کا اہتمام کرتا ہے، حتیٰ کہ اس اجنبیت و غربت میں ان کے لئے اسباب سکینت و طمانیت (لتسکنوا إلیھا) بھی مہیا فرماتا ہے.......... پھر وقت آتا ہے کہ وہ اپنے اہل خانہ کو لے کر واپس ہوتے ہیں، اثنائے راہ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے، راستہ بھیانک اور سنسان ہے کہ اہلیہ محترمہ دردِزہ میں مبتلا ہوتی ہیں، موسیٰؑ کو آگ کی تلاش ہوتی ہے تاکہ بیوی رات کی اس ناقابل برداشت سردی میں کچھ تاپ کر آرام حاصل کر سکیں، لیکن یہاں قدرتِ الٰہی کچھ اور کرشمے دکھاتی ہے، آگ کی تلاش کے نتیجہ میں انہیں وہ نور اور وہ روشنی حاصل ہوتی ہے جس سے سارے عالم کو منور و فیض یاب ہونا ہے، موسیٰؑ صرف ایک عورت کے لئے مدد و چارہ سازی چاہتے ہیں لیکن اللہ انہیں اس وقت کی تمام انسانیت کی چارہ سازی اور سامان راحت و سکونیت عطا فرماتا ہے اور انہیں پیغمبری و رسالت کی دولت و عزت سے سرفراز فرماتا ہے ؎

خدا کی دین کا موسیٰؑ سے پوچھئے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں، پیمبری مل جائے

موسیٰؑ فرعون کے پاس آتے ہیں، فرعون شان و شوکت اور اپنے نشۂ حکومت و سطوت میں سرشار ہے، اپنے روساء و انصار اور مصاحبین و اہل دربار کے ساتھ سریر آرا ہے، یاد رہے کہ یہ وہ موسیٰ ہیں جن کی کل تک تلاش تھی، اور جن کے قتل و گرفتاری کے لئے فوج اور پولیس سرگرداں تھی، جرم ان پر ثابت ہو چکا ہے، اس جرم کے مطابق اب وہ مدعا علیہ ہیں، مزید یہ کہ زبان میں لکنت بھی ہے...... ان کا پہلو اور موقف نہایت کمزور، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرعون، اسکے مصاحبین و اہل دربار، ان کے پیغام و رسالت، ان کے عقیدہ و ایمان اور اس کی صداقت و حقانیت پر انکے بحث و استدلال اور ان کے اظہار و اعلان پر غضبناک ہو جاتے ہیں، فرعون ساحران مصر کو موسیٰؑ کے مقابلہ کیلئے بلاتا ہے تاکہ ان کے زورِ فن سے معجزات موسیٰؑ کا جواب دے اور ان کو بیکار و غیر مؤثر ثابت کرے، کہ اس نے ان کو مداری کا کرتب اور جادو کا کھیل سمجھا تھا، اللہ تعالیٰ ہمیشہ کی طرح یہاں بھی بالکل خلاف امید اور ظاہری اسباب کے برعکس موسیٰؑ ہی کا پلہ بھاری رکھتا ہے۔ سارے کے سارے جادوگر دیکھتے ہی دیکھتے سپر انداز ہو جاتے ہیں، موسیٰؑ کی برتری تسلیم کر لیتے ہیں، اور زبان سے کہتے ہیں آمنا برب العالمین رب موسی و ہارون (ہم ایمان لائے مالک دو جہاں پر، ہم ایمان لائے موسیٰؑ و ہارون کے رب پر)

ابھی اور سنئے، موسیٰؑ کو حکم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو راتوں رات سرزمین ظلم و جور سے نکال کر مقام امن و نجات کی طرف لے جاؤ، فرعون کو پتہ لگ جاتا ہے، وہ اور اس کی افواج پیچھے پیچھے ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ کی مصلحت و مشیت یوں نمودار ہوتی ہے کہ موسیٰؑ راستہ بھول جاتے ہیں اور بجائے شمال

ومشرق کے عین مشرق کی سمت روانہ ہوتے ہیں......... سپیدۂ سحر کے ساتھ ساتھ سمندر کی لہریں جھلملاتی نظر آئیں، سامنے لہریں لیتا ہوا سمندر تھا پیچھے مڑ کر دیکھا تو ظالم دشمن کی فوجوں کا سمندر موجیں مار رہا تھا، بنو اسرائیل کی حالت چکی کے دوپاٹ کے درمیان حقیر دبے بس دانہ ہائے گندم کی تھی، کہ اللہ کی مدد......... وہی خلاف قیاس و خلاف اسباب وخلاف عقل و فہم مدد......... نمودار ہوتی ہے، سمندر پایاب ہو جاتا ہے، کئی جگہ سے پانی پھٹ جاتا ہے، سمندر پر خشکی کے راستے بن جاتے ہیں اور وہ رُکا ہوا پانی بلند ٹیلوں اور عظیم دیواروں کی شکل میں کھڑا ہو جاتا ہے، موسیٰؑ اور ان کی قوم سمندر عبور کر لیتی ہے، فرعون بھی اپنی فوج کے ساتھ انہیں راستوں پر چل پڑتا ہے، لیکن سمندر کی پُر غضب موجیں فرعون اور اس کے پورے لشکر کو لقمۂ نہنگ بنا لیتی ہیں، اور ہمیشہ کے لئے وہ سب وہیں غرق ہو جاتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ کس طرح فرعون اور اس کی ساری کی ساری طاقتور، دولتمند اور اسباب و وسائل سے ہر طرح لیس و مسلح قوم ایک بے سر و سامان، وبے ہتھیار قوم کے مقابلہ میں ہلاک ہو کر رہ گئی، اور بالآخر وہی مفلس وبے ساز وسامان قوم بنی اسرائیل زمین کی مالک و مختار بنی۔

وأورثنا القوم الذين كانوا يستضعفون مشارق الارض و مغاربها التى باركنا فيها و تمت كلمة ربك الحسنىٰ علىٰ بنى اسرائيل بما صبروا و دمرنا ما كان يصنع فرعونُ و قومه و ما كانوا يعرشون

"اور وارث کیا ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور ہو رہے تھے اس زمین کے مشرق و مغرب کا کہ جس میں ہم نے برکت رکھی ہے، اور پورا ہوا تیرے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل پر، اس بنا پر کہ وہ ٹھہرے رہے، اور برباد کر دیا ہم نے وہ جو بنایا تھا فرعون اور اس کی قوم نے اور وہ جو انگور چڑھایا کرتے تھے چھتریوں پر۔"

آپ ذرا غور کریں وہ کون سی طاقت ہے اور اس میں کیا راز ہے جس کی بنا پر موسیٰؑ نے اپنے ملک اور اپنے زمانے کی سب سے بڑی (سپر پاور) طاقت پر غلبہ حاصل کیا، اور بنی اسرائیل جیسی نہتی قوم نے اپنے کثیر التعداد اور کثیر الوسائل حریف پر فتح پائی، وہ کون سا ہتھیار ہے جس کو لے کر انہوں نے عظیم الشان اور زبردست دشمن کا مقابلہ کیا اور اسے زیر کیا، اور اپنے باغی و حیات کش ماحول کو اپنے ہم مرضی اور تابع بنا لیا؟

موسیٰ علیہ السلام کا قصہ قرآن مجید میں آپ نے بارہا پڑھا ہوگا، ایک مرتبہ پھر اس نقطۂ نظر سے اور اس سوال کو سامنے رکھ کر پڑھ جایئے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ ہتھیار جس کے ذریعہ موسیٰؑ فرعون اور اس کی قوم کا مقابلہ کر سکے اور بنی اسرائیل غالب آئے اور جس کی بدولت مصر اور "مشارق

الارض و مغاربها" کے وہ وارث و مالک بنے وہ صرف "ایمان" "اطاعت" اور "دعوت الی اللہ" کی طاقتیں ہیں، یہ ایمان اور یہ اطاعت گزاری اور جذبۂ دعوت اس پورے قصہ کی جان اور اس کا اصل عنوان ہے، یہ پیغمبرانہ ایمان اس وقت عیاں ہوتا ہے جب موسیٰ فرعون اور اس کی قوم کو پیغام الٰہی پہنچاتے ہیں، یہ ایمان ہی کی تو طاقت تھی جس کی بنا پر موسیٰ علیہ السلام فرعون کی سیاست اور شاطرانہ چالوں اور موشگافیوں سے پست نہیں ہوئے، اور بالآخر غالب آئے، وہ چاہتا ہے کہ موسیٰ کو ان کے اصل موضوع و مقصد سے ہٹا دے، اور ان کو دوسری باتوں میں پھنسا لے، کبھی چاہتا ہے کہ اپنے مصاحبین و درباریوں کو ان کے خلاف بھڑکا دے، لیکن موسیٰ اپنی دعوت اور اپنے اصل پیغام پر جمے رہتے ہیں، اپنے راسخ العقیدہ یقین و ایمان و عقیدہ کو ایک لمحہ کے لئے نہیں بھولتے، ان کے پائے استقامت میں ذرا بھی لغزش اور تزلزل نہیں پیدا ہوتا، فرعون کہتا ہے "ما رب العالمین" تمام عالموں کا رب (جس کا بار بار تمہارے منہ سے تذکرہ سنتا ہوں) کون ہے؟ جواب دیا "رب السماوات و الارض و ما بينهما إن كنتم موقنين" (وہ جو تمام آسمانوں اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو ان کے درمیان ہیں پیدا کرنے والا ہے اگر تم یقین کرو) فرعون غصہ میں بھر جاتا ہے، چاہتا ہے کہ اہل مجلس بھی غصہ ہو جائیں، اپنے گرد والوں سے کہتا ہے "ألا تستمعون" کیا سنتے نہیں ہو، لیکن موسیٰ اپنی بات چھوڑتے نہیں، فرماتے ہیں "ربكم و رب آبائكم الاولين" (رب العالمین وہ ہے) جو تمہارا اور تمہارے اگلے باپ دادوں کا رب ہے، فرعون غصہ سے بے قابو ہو جاتا ہے اور جھنجھلا کر کہتا ہے "إن رسولكم الذى ارسل إليه لمجنون" یہ تمہارے لئے پیغام لے کر آنے والا مجنوں ہے، موسیٰ اب بھی اس کی بات کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے، اور اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہیں، "قال رب المشرق و المغرب و ما بينهما إن كنتم تعقلون" فرمایا وہ مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کا پیدا کرنے والا ہے، اگر تم سمجھ رکھتے ہو، (تو جانو)

اس کے بعد فرعون انتہائی سیاست سے کام لے کر ایک بہت خطرناک موضوع چھیڑتا ہے اور ایک بہت اشتعال انگیز سوال کرتا ہے، پوچھتا ہے "ما بال القرون الاولى" ان گزشتہ لوگوں کی کیا کیفیت ہے؟ (ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے) لیکن موسیٰ اپنے پختہ اور قوی ایمان اور پیغمبرانہ حکمت عملی کی وجہ سے موقع کی نزاکت پر غالب آجاتے ہیں، جواب دیتے ہیں "علمها عنده ربى فى كتاب لا يضل ربى و لا ينسى" ان کی خبر میرے رب کے پاس لکھی ہے، نہ بہکتا ہے میرا رب، نہ بھولتا ہے......... اور اتنا کہہ کر اپنی پہلی بات، اپنے معبود حقیقی اور خدائے بے ہمتا و لاثانی کی ثنا و تعریف میں پھر لگ جاتے ہیں، کہنے لگتے ہیں "الذى جعل لكم الارض مهداً و سلك لكم فيها سبلاً

وانزل من السماء ماءً فاخرجنا به ازواجاً من نباتٍ شتی" (میرا رب) وہ ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا، اور چلائیں تمہارے لئے اس میں راہیں اور نازل کیا آسمان سے پانی، پھر نکالے ہم نے اس میں سے مختلف قسم کے بہت سے سبزے۔

اس ایمان و یقین کا سب سے زیادہ کامل اور واضح ظہور اس وقت ہوتا ہے جبکہ موسیٰؑ اپنے سامنے موجیں مارتا ہوا سمندر دیکھتے ہیں، پیچھے دیکھتے ہیں تو دشمن کی فوج جوش غضب میں موجیں مار رہی ہے، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن، نہ ایک قدم آگے بڑھنے کی گنجائش، نہ ایک قدم پیچھے ہٹنے کی، وہ اور ان کی ساری قوم گویا چکی کے دو پاٹوں کے درمیان تھی جہاں پس کر ہلاک ہو جانے کے سوا کوئی صورت فرار نہیں، بنو اسرائیل کے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے دہشت اور خوف و اضطراب میں واویلا کرتے ہیں "إنا لمدرَکون" ہم تو فرعون کے پنجۂ غضب میں گرفتار ہوئے۔ لیکن موسیٰؑ ہیں کہ اپنی جگہ کوہِ استقامت، ایک لمحہ کے لئے دل میں کوئی شبہ و اندیشہ نہیں ہوا ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی حوصلہ مند اور پرامید ہیں، انہیں یقین ہے کہ ان کا اللہ اپنے بندے کا مددگار ہے، وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا، پورے حزم و وثوق کے ساتھ اعلان فرماتے ہیں۔ "کلا إن معی ربی سیہدین" ہرگز نہیں، میرے ساتھ میرا رب ہے، وہ مجھ کو راستہ دے گا۔

آپ دیکھئے کہ ان حالات میں کہ جب بنی اسرائیل مصر میں ذلت و مشقت اور عسرت و فقر اور بدبختی و درماندگی کی زندگی گزار رہے ہیں، ظلم و استبداد کی شقی ترین قسموں اور صورتوں کو جھیل رہے ہیں ان کو کس بات کی ہدایت کی جاتی ہے؟ ان مصائب و آلام سے چھٹکارا پانے کیلئے ان کو کس چیز کا حکم دیا جاتا ہے؟ ان سے نہیں کہا جاتا .... اگرچہ عقل کی میزان میں اور آج کی دنیا میں یہی اس کا واحد حل ہے .... کہ مادّی اسباب اور ذرائع و وسائل پر اپنی پوری توجہ مرکوز کردو، حتیٰ کہ فرعون اور اس کی قوم کے انتظامات اور ساز و سامان اور آلات و وسائل تمہارے سامنے ماند پڑ جائیں، تاکہ پھر اس پر غلبہ حاصل کر سکو، بلکہ ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کو پکارو، اس کی طرف متوجہ ہو اس کی قدرت، طاقت اور حاکمیت کا یقین پیدا کرو، اطاعت و فرمانبرداری کی شرط پر اس کی مدد و نصرت کے وعدے پر راسخ و کامل ایمان رکھو، اس پر بھروسہ و اعتماد کرو، اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو قوی کرو، یہاں تک کہ اللہ کی مدد کے مستحق ہو جاؤ، اور تمہارے اندر نیابت الٰہی اور خلافت ارضی کی صلاحیت اور شان پیدا ہو جائے، اس وقت ہم اس کا خارجی ظہور بھی کر دیں گے۔

و أوحینا إلیٰ موسیٰ و أخیه أن تبوأ لقومکما بمصر بیوتا و اجعلوا بیوتکم قبلةً و أقیموا الصلوٰة و بشر المومنین

''اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی کو کہ ٹھہراؤ اپنی قوم کے واسطے مصر میں سے گھر اور اپنے گھر قبلہ کی طرف، اور قائم کرو نماز اور خوش خبری دے دو ایمان والوں کو۔''

اطاعت و فرماں برداری کی مثال دیکھئے، آپ دیکھیں گے کہ حکم الٰہی کے سامنے سر جھکا دینے اور بے چون و چرا اور بسر و چشم بات مان لینے میں پیغمبر کس حد تک بڑھے ہوتے ہیں، حال یہ ہے کہ اچانک حکم ہوتا ہے "إذهب إلىٰ فرعون انه طغى" (جاؤ فرعون کے پاس اس نے بہت سر اٹھایا ہے) اور یہ فرعون ہے کون؟ کس کے پاس جانے کا حکم ہو رہا ہے؟ بادشاہ وقت کے پاس وہ بھی ایسا کہ جو غضب ناک اور جوش انتقام سے بھرا ہوا ہے جس کی گرفت شیر کے چنگل سے کم نہیں، جس کے دبدبہ و سطوت کے سامنے کوئی چیز ٹھہرتی نہیں، اس فرعون کے سامنے اور ان ناموافق حالات میں موسیٰؑ کو اس کے پاس دعوت و پیغام لے جانے کا حکم دیا جا رہا ہے لیکن موسیٰؑ جاتے ہیں، بلا توقف و تردد قصر شاہی کا رخ کرتے ہیں، اس بادشاہ کے دیوان خاص میں جاتے ہیں جو خدائی و ربوبیت کا دعویدار ہے، اور اس کو دعوت دیتے ہیں کہ اللہ واحد و قہار کی عبادت کرے، اس کو خدا مانے اور اس کے آگے سر جھکائے، اور یہی نہیں کہ ایک دفعہ کہہ کر اور اعلان حق کر کے فرصت پا جائیں، موسیٰؑ اپنی اس دعوت اور جد و جہد اور اپنے وعظ و ارشاد میں لگے رہتے ہیں، یہاںتک کہ اللہ جو کہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ان کے اور ان کی قوم کے درمیان انصاو حق کو فیصل فرما دیتا ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ ''ایمان و اعتماد'' ''اطاعت و فرمانبرداری'' اور ''دعوت الی اللہ'' ہی وہ طاقت تھی کہ جس سے موسیٰؑ نے مشکلات زمانہ کا مقابلہ کیا اور جس کے ذریعہ اور جن کی بدولت سطح زمین کی سب سے بڑی شہنشاہی .... اسی شہنشاہی پر کہ جو باعتبار تمدن سب سے زیادہ ترقی یافتہ باعتبار وسعت سب سے زیادہ وسیع باعتبار اسباب و وسائل سب سے زیادہ غنی اور سرمایہ دار اور باعتبار شوکت و دبدبہ سب سے زیادہ عظیم و باہیبت تھی .... فتح و غلبہ حاصل کیا۔

اگر موسیٰؑ آج کے مفکرین و قائدین کی طرح بنی اسرائیل کے صرف ایک مفکر و لیڈر ہوتے، اور اسی طرح سوچتے جس طرح آج کے ''سیاست دان'' زعماء سوچتے ہیں، اگر وہ ان اسباب و وسائل اور امکانات و مواقع کا جائزہ لیتے جو اس وقت ان کی قوم کو حاصل تھے، اور ہر چیز کو واقعیت اور حکمت عملی کے ترازو سے تولتے .... اور دوسری طرف وہ لوازمات شاہی دیکھتے، تعداد و مقدار اور ساز و سامان دیکھتے، فرعون کی افواج اور آلات حرب دیکھتے، اس کی ثروت و دولت اور احوال دیکھتے .... اور کیا انہوں نے دیکھا نہ تھا؟ کیا ان چیزوں سے وہ واقف نہ تھے؟ جبکہ ان کے مرکز عین قصر شاہی میں انہوں نے پرورش پائی اور جوانی تک وہیں رہے، لیکن اس کے باوجود ان کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہ تھی، اور

اس سب کو کسی شمار و قطار میں نہ لائے .... لیکن اگر وہ ایسا کرتے، اور ان چیزوں کو اہمیت دیتے اور نظروں میں لاتے، اور پھر ان چیزوں میں فرعون کی قوم سے اپنی قوم کا مقابلہ کرتے، تو کیا میزان "عقل" میں آج اور آج کے قانون سیاست میں ان کے لئے یہ جائز ہوتا اور ان کے لئے اس بات کا امکان اور گنجائش ہوتی کہ وہ فرعون کا مقابلہ کریں، اور اس سے وہ بات کہیں جو اس کے لئے سخت ناراضگی اور غیظ و غضب کا باعث بنے؟ آج کی عقل سلیم اور حکمت و سیاست اور فہم و فراست کی رو سے تو ضروری تھا کہ وہ اس جرأت بیجا کا تصور تک نہ کریں، بالکل فیصل شدہ اور یقینی راستہ ان کے سامنے یہ تھا کہ اپنی اور اپنی قوم کی حالیہ قسمت و نصیب پر قانع و مطمئن ہو جائیں، زمانہ کے حالات سے متفق ہو جائیں، وقت کے دھارے پر بہتے رہیں اور اپنی قوم کو بھی تلقین کریں۔

زمانہ باتونہ سازد توبا زمانہ بساز

نتیجہ یہ ہوتا کہ نہ ایمان کی ہوا چلتی، نہ صلاح و تقویٰ کے باغ لگتے، نہ اخلاق ہوتے نہ اعمال ہوتے، نہ شرافت ہوتی نہ انسانیت۔

لیکن یہ ہوتا کیسے، موسیٰؑ "قومی رہنما" نہیں تھے، خود ان کی رہنمائی کی جاتی تھی، وہ نبی تھے، ان کے سامنے اللہ کی ہدایتیں اور ان ہدایتوں پر عمل کرنے پر اس کی طرف سے نتائج وانعامات کے وعدے تھے، وہ ایک داعی اور اللہ کے دین کے مبلغ تھے، ان کا طرزِ فکر و عمل مبلغین واہل دعوت کا تھا اور فکر و عمل کا یہی وہ طریقہ ہے جس نے بارہا تاریخ کے دھارے بدل دیئے ہیں، یا وہ طاقت ہے جس کی کرشمہ سازی سے عجائب و خوارق کا ظہور ہوا ہے، جس نے بارہا عقل و دانش کو دم بخود کر دیا ہے۔

رسولوں کے سردار، سید الانبیاء اور خاتم الرسل محمد بن عبداللہ ﷺ کی حیات مبارکہ سب سے زیادہ مفصل اور واضح آپ کے سامنے ہے، اگر آپ نے بھی عام رہنماؤں کی طرح سوچا ہوتا، اور وہ اسباب ووسائل اور لوازمات و انتظامات کہ جو قریش کے پاس تھے آپ نظروں میں لاتے .... اگر آپؐ نے وقت کی ان دو عظیم الشان شہنشاہیوں کی طرف نظر کی ہوتی، جنھوں نے اس وقت کے تمام آباد اور متمدن خطۂ زمین کو آپس میں تقسیم کر رکھا تھا یعنی شہنشاہیت روم اور شہنشاہیت ایران، اور وہ تمام طاقتیں اور اختیارات و اقتدارات کہ جن سے وہ بہرہ مند تھے، آپؐ نظر میں لاتے، اور آپؐ ایسا کر سکتے تھے، بالخصوص جب کہ آپؐ ان کی طاقت و قوت اور ان کی وسعت مملکت سے واقف تھے، اور ان کا پورا اندازہ رکھتے تھے، اور کیوں نہ رکھتے کہ آپ پیغمبرانہ فہم، ہوش و بیدار مغزی رکھتے تھے لیکن پھر بھی آپؐ کی سیرت مبارکہ بتلاتی ہے کہ آپؐ نے بالکل ان چیزوں کو کوئی اہمیت نہ دی، اگر آپؐ نے ایسا کیا ہوتا تو کیا میزان عقل اور قانون خرد میں یہ جرأت مناسب و معقول ہوتی کہ آپؐ تمام انسانیت کو اپنے پیغام کا مخاطب بنائیں، اور

یہ کہ اس عہد کی دنیا کے دو مالک و خود مختار اور مغربی و مشرقی شہنشاہیوں کے دونوں سربراہوں کو یہ خط لکھیں کہ وہ اسلام کی دعوت قبول کریں، اگر آپؐ نے اس طرح سوچا ہوتا تو وہی صورت حال اور عالم کا وہی نقشہ جو اس وقت عالم پر چھایا ہوا تھا اور صدیوں سے چھایا ہوا تھا اب بھی قائم رہتا، اور شاید ہمیشہ کے لئے دنیا کی قسمت میں یہی صورت حال لکھ دی جاتی، اگر فتح و ظفر کا انحصار و دار و مدار انہیں مادیات و وسائل پر آپؐ سمجھتے تو کب وہ دن آتا جب آپؐ پر ایمان لانے والی ایک مٹھی بھر جماعت اس قوت و طاقت اور سامان و وسائل کی مالک ہوتی جو ان دو عظیم شہنشاہیوں کی قوت و طاقت کا مقابلہ کر سکے؟ بلکہ نہیں آپؐ تو اس قوت و طاقت کو سوچتے جو ان سے بھی بڑھی ہوئی ہو، اور جو ان کو شکست دے سکے اور ان پر غلبہ حاصل کر سکے، اور اگر انہیں چیزوں پر دارومدار ہوتا تو کب تک آپؐ کے لئے واجب اور ضروری ہوتا کہ آپؐ انتظار فرماتے رہیں؟ پھر اُس وقت اس دنیا اور اس انسانیت کا کیا انجام ہوتا؟ یقیناً انسانیت کی قسمت پر مہر لگ گئی ہوتی، اور یاد رہے کہ یہ مہر پھر قیامت تک کبھی نہ ٹوٹتی، افق انسانیت پر صبح سعادت کا طلوع کبھی نہ ہو پاتا، اور انسانیت کی تاریخ موجودہ تاریخ کے بجائے کچھ اور ہوتی۔

لیکن اللہ کو ابھی انسانیت کے ساتھ خیر مقصود تھی، اللہ نے آپ کو "رہنما" نہیں بلکہ رہنمائے راہ یافتہ اور ہادی مہدی بنایا تھا، آپؐ وہی کرتے تھے جو آپ کو حکم ملتا تھا، آپ کو جو احکام و ہدایات اوپر سے ملتی تھیں، انہیں کا آپ اس عالم میں نفاذ فرماتے تھے، آپؐ کو ان احکام و ہدایات پر اعتماد کلی تھا، آپ ان نتائج اور ان پر اللہ کے وعدہ و انعامات پر اس طرح یقین رکھتے تھے، گویا آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں، آپؐ کا ایمان تھا کہ کمزور اللہ کی مدد و حمایت کے ساتھ بہت قوی ہوتا ہے، وہ کبھی شکست نہیں کھا سکتا، اور وہ قوی جس کے ساتھ اللہ کی مدد و حمایت نہ ہو انتہائی ضعیف ہے، وہ کسی کا بال بیکا نہیں کر سکتا، آپ کے سامنے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد تھا کہ "إن ینصرکم اللّٰہ فلا غالب لکم و ان یخذلکم فمن ذا الذی ینصرکم من بعدہ و علی اللّٰہ فلیتوکل المومنون"

(اگر اللہ تمہارا امدادگار ہو جائے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا، اور اگر وہ تمہیں اپنی مدد سے محروم کر دے تو کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے اس کے بعد، اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

آپ کو بتلایا جا چکا تھا کہ "کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن اللّٰہ" (کتنی ہی قلیل التعداد جماعتیں غالب آئی ہیں اللہ کے حکم سے کثیر التعداد جماعتوں پر) آپ سے بڑھ کر ان وعدوں پر کہ جو اعتقاد عمل صالح توحید، جہاد فی سبیل اللہ اور اِعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئے گئے ہیں، کون ایمان و یقین رکھنے والا اور ان پر کامل و راسخ اعتماد و ایمان کرنے والا ہو سکتا ہے، نتیجہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

"أعدوا لهم ما استطعتم" کے تحت حتی الامکان تیاری وانتظام کے بعد آپ نے اور آپ کے سچے وصحیح جانشینوں نے ہر بڑی سے بڑی طاقت سے ٹکر لی، اور زمین وآسمان کا نقشہ بدل ڈالا، سیلابوں اور طوفانوں کے رخ پھیر دیئے، جس کی بدولت آج تک دنیا میں ایمان، توحید، حقانیت، صداقت، نیکی، اخلاق، محبت، شرافت اور انسانیت کی روشنی موجود ہے ۔

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے　　یہ سب پودا نہیں کی لگائی ہوئی ہے

آپ کو غلط فہمی نہ ہو، جو آپ سے یہ باتیں کر رہا ہے، وہ ان لوگوں میں نہیں ہے جو اسباب ووسائل کے ترک واہمال کی دعوت دیتے ہیں، اور ترک سعی اور تعطل کو "اعتماد وتوکل" کہتے ہیں، میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو عالم خواب وخیال میں رہتے ہیں، جن کی باتوں کا عملی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، میں نے عالم اسلام کو اور ان قوموں اور حکومتوں کو کہ جن کے ہاتھ میں اس عالم کی زمام قیادت رہی ہے، ان کی اس کوتاہی اور تقصیر پر ہمیشہ سخت ملامت کی ہے جو انہوں نے حربی وصنعتی تیاری کے سلسلہ میں برتی ہے، میں نے ان کے اس تغافل اور عدم توجہی کو انسانیت کی شقاوت اور بدبختی اور اس کے ہدایت وتعمیر اور ترقی واقبال مندی کے راستہ سے ہٹ کر زوال وانہدام اور شقاوت وبدبختی کے راستہ پر پڑنے کے اسباب میں سے ایک اہم سبب شمار کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجھے اس طرز فکر سے شدید اختلاف ہے جو اس وقت تمام عالم اسلام کی عقلیت پر مسلط ہے، میں اسے بالکل پسند نہیں کرتا کہ مختلف گوشہ ہائے عالم میں پھیلی ہوئی اسلامی جمعیتوں کو ایک جامد اور غیر متحرک، بلکہ غیر ذی حیات انسانی بھیڑ سمجھا جائے، بالکل ویسے ہی جیسے کہ اس وقت عالم کے بقیہ تمام انسانی گلے ہیں، جو بھیڑوں اور چوپایوں کے ریوڑ سے زیادہ کوئی حیثیت اور حقیقت نہیں رکھتے، جن کے پاس دنیا کو دینے کیلئے کوئی پیغام اور کام کی بات نہیں، جن کے مقام اور جن کے اقتدار کا فیصلہ ہمیشہ صرف مادی ترقیوں اور وسائل وآلات کی فوقیت پر ہوتا ہے، یہ اسلام اور اہل اسلام کے ساتھ "ازالۂ حیثیت عرفی" کے مرادف ہے کہ ان کو اس عام انسانی ترازو پر تولا جائے، اور ان کے اصل سرمایہ اور ان کی عظیم طاقت "ایمان باللہ" "اطاعت" اور "پیغام ودعوت کی روح" کو نظر انداز کر دیا جائے، اگر غیر مسلم اقوام ان کو اس معیار سے تولتی ہیں تو وہ معذور ہیں کہ ان کو اس روحانی ایمانی طاقت کے سرچشمہ کا احساس واندازہ نہیں، لیکن مسلمان خود انہیں اسی ترازو پر تولیں، یہ ان کیلئے بڑے شرم وعار کی بات ہے اور بڑی حسرت وماتم کا مقام ہے ۔

مومناں با خوئے وبوئے کافراں　　لا الٰہ گویاں واز خود منکراں

یہ بیشک صحیح ہے کہ ہم مادی ساز وسامان کے اعتبار سے فقیر ہیں، ہم کمزور ونہتے ہیں، علم وصناعت کی دوڑ میں ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں، سیاست اور اقتصادی حالت میں اور قوموں کو نہیں پہنچتے،

ان چیزوں میں ہم میں اور اقوام مغرب میں صدیوں اور قرنوں کا فرق ہو گیا ہے.......... اور بڑی حد تک یہ ضروری بھی ہے کہ یہ چیزیں ہمارے قائدین وزعماء کے فکر واہتمام کا موضوع بنیں، اور یہ باتیں خاصی توجہ والتفات کی مستحق ہیں.......... لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہم اس کے بغیر بھی دنیا میں عظیم طاقت ہیں، ہمارا صرف وجود بڑی قیمت رکھتا ہے، ہمارے پاس وہ پیغام، وہ دعوت اور وہ دین ہے جو انسانیت کی غذا اور اس کی روح ہے، یہ وہ چیز ہے جس کے بغیر دنیا میں اس وقت ایک دردناک والمناک انجام کی طرف تیزی سے بڑھتی جارہی ہے اور روز بروز اس قعر ہلاکت سے قریب تر ہوتی جارہی ہے، اور قریب ہے کہ کسی دن یہ انجام ہلاکت انسانیت مجسم کو نگل جائے.......... ہمارے پاس وہ ایمان ویقین ہے جو امانت واحساس ذمہ داری پیدا کرتا ہے، جواب دہی اور باز پرس کا خوف پیدا کرتا ہے، نفس لوامہ پیدا کرتا ہے، اچھے برے کی تمیز پیدا کرتا ہے اور صرف ذاتی ووقتی لذت ونفع کو اچھے برے کا معیار نہیں بننے دیتا، یہی وہ طاقت ہے جو کار خیر اور خدمت خلق کے جذبات دلوں میں پیدا کرتی ہے، اور اندر سے اس کے تقاضے اور داعیے پیدا ہوتے ہیں۔

آج کی متمدن دنیا کی وہ قومیں جن کو دنیا کی امامت وپیشوائی کا دعویٰ ہے اس طلسمی طاقت اور اس "کلید حیات" سے محروم ہیں، جنہیں ہم آج "سرمایہ دار" قومیں کہتے ہیں وہ اس سرمایہ عظیم کے اعتبار سے دیوالیہ ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ یہ اسباب ووسائل اور آلات واسلحہ، اور ساز وسامان ولوازمات آسائش ضائع ہیں.......... صرف ضائع اور غیر مفید نہیں.......... بلکہ وبال جان اور ہلاکت وبربادی کا ذریعہ بن رہے ہیں، اور ان کو موت کے گڑھے کی طرف لے جارہے ہیں، یورپ کو سخت ضرورت ہے کہ جلد از جلد اس آب حیات اور سرمایۂ زندگی کو قبول کرلے، یہی وہ واحد نسخۂ شفا ہے جس سے اسکے مزمن ومہلک مرض کا علاج ہو سکتا ہے، ہم مسلمانان عالم مغرب کے ان علوم وفنون اور ان ایجادات وصناعات کے اتنے محتاج وضرورت مند نہیں جتنا کہ مغرب ہمارے ایمان ویقین کا محتاج ہے، یہ ایمان ہی صالح معاشرے کی اساس وبنیاد ہے، پھر اس ایمان ویقین کے بعد وہ قانون اور شریعت ہے جو آج بیسویں صدی کی تمام مشکلات اور پیچیدگیوں کا صحیح حل پیش کرتی ہے، یوں سمجھئے، صاف واضح اور بلیغ الفاظ میں کہ ہمارے پاس ایک پیغمبر کے وجود کی نعمت موجود ہے جو تمام عالم کیلئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے، یہ ایمان وشریعت اسی کی امانتیں ہیں کہ جس کے ہم مسلمان حامل ہیں، اللہ کا فیصلہ ہے کہ اب قیامت تک تمام وہ لوگ جو اپنے پیدا کرنے والے کی مرضی وخوشنودی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کو راستہ یہیں سے ملے گا، یہیں وہ نور ہے جو صراط مستقیم دکھاتا ہے، اور تاریکیوں اور گمراہیوں سے نکال کر منزل مقصود تک پہونچاتا ہے

گماں آباد ہستی میں یقیں مرد مسلماں کا بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

مسلمان اپنا مقام پہچانیں، ہماری ذمہ داری اور فریضہ ہے کہ ہم اس وقت حیران، سراسیمہ اور سرگرداں و آوارہ یورپ کو صحیح راستہ کی طرف بلائیں، اپنے دنیاوی فوائد، منافع اور راحتوں اور لذتوں کو بالکل نظر انداز کرکے، انتہائی اخلاص و دلسوزی کے ساتھ، اور اس اعتماد و یقین کے ساتھ کہ یہی ہمارا منصب و مقام ہے، ہم ہی اس وقت عالم کی اصلاح و رہنمائی کی قوت و صلاحیت رکھتے ہیں، ہم ہی اس کے صحیح مبلغ و مصلح ہیں، ہم اس کے نجات دہندہ ہیں، ہم ہیں جو اس کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضامندی اور جنت و حیات دوام کا راستہ دکھا سکتے ہیں، اور اس کو انعامات کی بشارت سنا سکتے ہیں، ہم ہی ہیں جو اس کو اللہ کی ناپسندیدگی اور اسکے عذاب، دوزخ و جہنم سے ڈرا سکتے ہیں، اور اس کو بچا سکتے ہیں

اے بندۂ مومن! تو بشیری، تو نذیری افرنگ ز خود بے خبرت کرد وگرنہ

ہمیں اپنے ایمان و یقین کی اس عظیم طاقت سے کام لینا چاہئے، ہمیں چاہئے کہ ہم قافلۂ انسانی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لیں، یہ کیا شومیٔ قسمت ہے کہ ایک عرصہ سے ہم گرد کارواں بنے ہوئے ہیں، اس کہنہ دماغی کو ہم کب تک عقل و دور اندیشی کہتے رہیں گے، اس معمورۂ عالم میں بہت سے گوشے ایسے ہیں جہاں فطرت سلیم کے خزانے مدفون ہیں، ایشیاء افریقہ کے وسیع خطہ ہائے ارض ایسے ہیں جہاں زرخیز و شاداب ذہنوں پر محبت و پر خلوص دلوں اور طاقتور و صناع ہاتھوں کی کمی نہیں، ہمیں ان کو دین و ایمان، زندگی کے حقیقی و نیک مقاصد اور کائنات کے افضل و برتر اصول و حقائق پہونچانا چاہئے، آپ یقین کریں کہ یہ قومیں اس چیز کی پیاسی ہورہی ہیں، اور آپ کے انتظار میں ہیں ؎

ہم آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

امید یہاں تک کی جاتی ہے کہ انکے ایمان قبول کرلینے کے بعد اور اسکو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اور اس کے دلوں میں اتر جانے کے بعد اور اس پیغام و دعوت اور مشن کو خود اپنا لینے کے بعد تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوگا، اور جسطرح عہد اول میں ایرانیوں ترکوں اور دیلمیوں کے ایمان لانے سے، اور قرون وسطیٰ میں تاتاریوں اور مغلوں کے اسلام لانے سے تاریخ کے دھارے بدل گئے ہیں، آج بھی بدلیں گے۔ لیکن اس انقلاب کی بنیاد کیا ہے؟ اس کی بنیاد اپنے اندر کا فکری انقلاب ہے؟ ہم کو بلا توقف و تاخیر اپنا موجودہ انداز فکر بدل لینا ہے، اور اس طرح پر سوچنا ہے جس طرح پیغمبر سوچتے ہیں، یہی انقلابِ فکر باذن اللہ عالم میں انقلاب کا باعث ہوگا، اس کے بغیر دنیا کی کوئی طاقت عالم کو وحشت و درندگی، آدم کشی اور غارت گری کے گڑھے سے نہیں نکال سکتی، عرصہ سے بڑے بڑے عقلاء عالم تدبیرِ نو کرکے عاجز آچکے ہیں، اس کے لئے تو "شان کلیمی" ہی درکار ہے ؎

صحبت پیر روم سے مجھ پر ہوا یہ راز فاش لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف